اجتماعی اجتہاد

مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

نام کتاب	:	اجتماعی اجتہاد
مصنف	:	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
صفحات	:	۴۸
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
سن اشاعت	:	اکتوبر ۱۹۹۹ء
کمپوزر	:	محمد خالد اعظمی
طباعت	:	بھارت آفسیٹ، دہلی ۔ ٦
قیمت	:	۳۰/روپئے

ناشر

مجمع الفقه الاسلامی (الهند)

۱٦۱۔ایف جوگابائی، جامعہ نگر پوسٹ بکس نمبر ۹۷۴٦

نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵، فون وفیکس : ۹۷۷۲۱۸٦۔۰۱۱

بسم الله الرحمن الرحيم

تقریظ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اسلامک فقہ اکیڈمی کے مختلف فقہی سیمیناروں میں جو مہتم بالشان پر مغز وو قیع علمی خطبات پیش فرمائے۔ اکیڈمی ان کو ''اجتماعی اجتہاد'' کے عنوان سے عمومی افادہ کی غرض سے شائع کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو ملت اسلامیہ کے لئے نافع و مفید بنائے۔

عصر حاضر کے ممتاز اہل قلم اور اسلامی مفکرین کی جانب سے اجتماعی اجتہاد کے موضوع پر قیمتی مدلل تحریریں مسلسل آتی رہی ہیں، جو عالم اسلام کے علمی و فقہی حلقوں میں باوزن حیثیت سے تسلیم کی گئیں اور انہیں اعتبار و استناد کی نظروں سے دیکھا گیا۔

بلاشبہ یہ موضوع بڑا وسیع اور جہت دار ہے، نیز یہ عمل فی نفسہ بہت مشکل اور نازک ہے۔

اسلام تا قیامت اپنی تابانی کے ساتھ قائم و باقی رہے گا اور قیامت تک کے لئے ہر زمان و مکان میں ابھرنے والے مسائل و مشکلات کا حل مقاصد شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ فقہاء پیش کرتے رہیں گے کیونکہ یہ دین کا تقاضا اور مطالبہ بھی ہے اور دین کی ابدیت و حیویت کی شان بھی یہی ہے۔ وما توفیقی إلا باللہ۔

مجاہد الاسلام قاسمی

مقدمہ

الحمد لله والصلاة والسلام علی رسول الله۔ اما بعد!!

اپنے خطبات و مقالات کا مجموعہ'' اجتماعی اجتہاد'' کے نام سے ملاحظہ کیا، ایک گم شدہ چیز نظر آئی، جو ذہن اور حافظہ سے نکل چکی تھی، اس کو پڑھ کر مسرت بھی ہوئی اور توفیق وہدایت ربانی پر شکرادا کیا۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ذمہ داروں بالخصوص اس کے صدر فاضل گرامی مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے، کہ انہوں نے اس کی حفاظت اور نشر واشاعت کا انتظام کیا، اور جو چیز خاص زمان ومکان کے ساتھ مخصوص تھی اس کو زمان ومکان کے حدود سے آزاد اور وسیع کیا، اللہ تعالیٰ اس کو مفید اور چشم کشا بنائے۔

خاکسار

ابوالحسن علی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۸/ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ

جمعرات ۲۲ جولائی ۱۹۹۹ء

فہرست مضامین

اجتهاد زمانه کی حاجت اوراس دین کی ضرورت هے

حضرات!

زندگی متحرک اور تغیر پذیر هے:

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل ومکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جاچکا ہے کہ:

الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دیناً (المائدہ: ۳)۔

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کرلیا۔

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا دین مکمل ہے، اور دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔

جاوداں پیہم دواں، ہردم رواں ہے زندگی

اس رواں دواں، سداجواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے اس کی بنیاد اگرچہ ''ابدی عقائد وحقائق'' پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے اور حرکت اس کی رگ وپے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت

رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ مستشرقین اور مغربی مورخین کے بقول کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، جیسا کہ ہم یونانی، رومی تہذیب یا ترک اور مغل فن تعمیر کے متعلق کہا کرتے ہیں، بلکہ وہ زندگی ہی کی طرح ایک زندہ دین اور ایسا ابدی پیغام ہے جو کہ طبعی حقائق اور نوامیسِ فطرت کی طرح بقائے دوام کی خلعت سے سرفراز ہے۔

ذلك تقدير العزيز العليم(الانعام/۱۲) (یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا)۔

صنع الله الذی أتقن کل شیء(النمل/۸۸) (کاری گری اللہ کی، جس نے ہر چیز کو محکم کیا)۔

یہ ایسا جامع اور مکمل دین ہے جس کے بعد کسی دوسرے دین کا نہ انتظار ہے اور نہ کسی پیغام کی ضرورت رہ جاتی ہے، دوسری طرف اس دین کے اندر مسلسل زندگی اور توانائی اور سرگرمی پائی جاتی ہے، مذہب اپنی اس صلاحیت کی بنا پر ''تغیّر'' کو ایک حقیقت مانتا ہے اور اس کے لئے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہو۔ مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے لیکن یہ محض ساتھ دینا یا محض ''رفاقت'' اور پیروی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے اور وہ غیر صالح تغیر ہے، یہ تخریبی رجحان ہے اور وہ تعمیری رجحان ہے، اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم سے کم اس مذہب کے پیرؤوں کے حق میں کیا ہوگا؟ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے وہاں زندگی کا محتسب اور نگراں اور اس کا اتالیق (**Guardian**) بھی ہے نہ کہ نظریاتی فلسفوں کی طرح جامد، بلکہ وہ زندہ انسانوں کے لئے زندگی و توانائی سے بھرپور ایسا مکمل اور جامع دین ہے جو اس کے احساسات سے واقف اور ضروریات اور تقاضوں کا اعتراف اور مشکل مسائل میں اس کی رہنمائی کرتا اور فساد اور بگاڑ کے راستہ پر جانے سے روکتا ہے۔

امت محمدیہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا فرمائی تھی کہ وہ مسلسل اور پیہم انقلابات اور لامتناہی مسائل ومشکلات کا سامنا کرے جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا، پھر زمانہ کے تغیرات، جگہ کی تبدیلی اور ماحول کے اختلاف وتنوع سے بھی اس کو واسطہ پڑا۔

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش سے اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے اور زمان ومکان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ ﷺ کو ایسی کامل ومکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کرسکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت وطاقت ہے اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی ''مردم خیز'' ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ ہر دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور ''زہر'' کو جس ''تریاق'' کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام جزیرۃ العرب سے (جہاں زندگی سادہ اور تمدن انتہائی محدود تھا) نکل کر مصر وشام، عراق وایران اور دوسرے وسیع، زرخیز اور سرسبز وشاداب خطوں میں پہونچ گیا تھا جہاں کا نظام تمدّن ومعیشت، تجارت، انتظام ملکی، سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات ومسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ، روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ (قرآن وحدیث اور سنت وقواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمه اربعه اور ان كی خصوصيات:

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کار عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے، اپنے تعلق باللہ، للّٰہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ واعزاز اور کسی لذت وراحت سے سروکار نہیں رکھا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کو دو بار عہدۂ قضاء پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا، یہاں تک کے قید خانہ میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ امام مالکؒ نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعیؒ نے زندگی کا بڑا

حصہ عسرت میں گذارا اور اپنی صحت قربان کردی، امام احمدؒ نے تن تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہل سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تن تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کردیا جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے۔ امام ابوحنیفہؒ نے تراسی (۸۳) ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے جن میں سے اڑتیس (۳۸) ہزار عبادات سے تعلق رکھتے ہیں اور پینتالیس ہزار معاملات سے (فخر الاسلام ۲/۱۸۸ بحوالہ مناقب ابی حنیفہ للمکی ۹۶)۔

شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے (سیرۃ النعمان، مولانا شبلی نعمانی، بحوالہ قلائد عقود القیان)۔ المدونہ میں جو امام مالکؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، (چھتیس ۳۶ ہزار) مسائل ہیں۔ کتاب الام جو امام شافعیؒ کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے۔ ابوبکر خلال (م ۳۱۱ھ) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کئے (کتاب کا نام الجامع لعلوم الامام احمد ہے)۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہوجانا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ ہوگئی جس کی دوسری قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہوچکی ہیں۔ اور وہ تدریجی طور پر ایسے لادینی راستے پر پڑ گئیں کہ ان کے لئے لادینی نظام زندگی اختیار کرنا ضروری ہوگیا، یا پھر ایسے غیر اسلامی قوانین کو انھیں اختیار کرنا پڑتا، جو اس کی دینی روح اور اصول ومبادی سے متصادم ہوں، اور وہ مسیحی یورپ کے نظریہ دین وسیاست کی تفریق کے ان اصولوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے جو خاص حالات و ماحول اور مسیحی مذہب کی مخصوص وضع اور ساخت کا نتیجہ تھا۔

اگر خدانخواستہ علمائے متقدمین فقہی اجتہاد و احکام اور مسائل کے استنباط و استخراج میں کسلمندی اور سستی اور ڈھیل سے کام لیتے اور جدو جہد کی زندگی کے بجائے راحت و آرام کو اختیار کرتے یا ان کے علمی کارنامے اہمیت کے حامل نہ ہوتے اور ان کے فطری ملکہ اور صلاحیت میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا تو اس وقت کی حکومت عملی زندگی اور وقت کے مطالبات و تقاضوں سے مجبور ہو کر رومی اور ایرانی قوانین کو اسلامی دنیا پر منطبق کر دیتی، اس لئے کہ نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا۔ تجارت و زراعت، جزیہ و خراج، محکومین اور مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں۔ ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جا سکتا تھا اور نہ سرسری طور پر ان سے گزرا جا سکتا تھا۔ حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون اختیار کرنے پر مجبور تھیں جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اور مساجد میں تھوڑے وقت اور محدود مدت کے لئے دینداری کی زندگی گذارنا اور اپنے گھروں، بازاروں اور عدالتوں میں زیادہ وقت جاہلی یا لادینی زندگی گذارنا اس کے لئے نوشتہ تقدیر بن جاتا، جیسا کہ اس وقت ان ملکوں اور حکومتوں کا حال ہے جن کا سرکاری مذہب تو عیسائیت ہے لیکن ان کے پاس مسیحی قانون شریعت موجود نہیں یا جیسا کہ (انتہائی شرمندگی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) ان ملکوں اور حکومتوں کا حال ہے جو عقیدے اور عبادات کی حد تک

تو مسلمان کہلاتی ہیں لیکن اسلام کو قانون شریعت کے طور پر قبول نہیں کرتیں، اگر یہ بات اس مسیحیت کے لئے قابل قبول اور گوارا ہے جو دستور اور قانون سازی کے سر چشمہ سے محروم ہے اور دین کو زندگی پر منطبق کرنے پر اس کو اصرار بھی نہیں لیکن یہ کسی طرح بھی اس اسلام کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا جو دین و دنیا اور عبادت و سیاست کا جامع ہے۔

چنانچہ امت اسلامیہ اپنی زندگی کے انتہائی سنگین مرحلہ سے گزر رہی تھی بلکہ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جہاں ایک غلطی یا معمولی لغزش بھی اس کے رشتۂ حیات کو اسلامی نظام اور قانون سے کاٹ کر رکھ دیتی اور آنے والی نسلوں کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی جس میں دین و مذہب کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں بھی نہ پائی جاتی۔

اسی طرح اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عبادات کے احکام و مسائل بیان کئے جائیں تاکہ سہو و نسیان اور انسانی بھول چوک اور شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے جو باتیں پیش آتی ہیں ان کو حل کیا جائے، جو لوگ نئے نئے اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے ہیں ان کے مسائل کا حل، نماز میں بھول چوک، رکعات میں کمی زیادتی، روزہ دار کے احکام و مسائل، زکوۃ کب اور کن چیزوں پر کتنی مقدار میں فرض ہے، اسی طرح حج جیسی عبادت جس کی ادائیگی میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے اور ایک بڑے رقبہ میں حاجی کو شعائر حج ادا کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور قدم قدم پر سنت اور اسوۂ نبوی کا لحاظ اس کو رکھنا پڑتا ہے۔ ان تمام امور میں فوری احکام اور بروقت فیصلہ کی ضرورت تھی، کسی ادنی تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی اس بات کی ضرورت کہ ہر کس و ناکس کو قرآن و سنت سے براہ راست رجوع کر کے مسائل اخذ کرنے کا مشورہ دیا جائے، اس لئے یہ ضروری تھا کہ احکام و جزئیات کا وجود ہو اور فقہی ذخیرہ آسانی کے ساتھ ہر ایک کو میسر آسکے، ایسے سرآمد روزگار علماء اور ماہرین شریعت کی موجودگی بھی ضروری تھی جو عوام کی رہنمائی کے لئے ہر وقت مستعد ہوں اسی بناپر

اسلام دیگر مذاہب کی طرح تاریخی یادگاروں کا ایسا میوزیم بننے سے محفوظ ہو گیا جہاں ہر طرح کی عبادات اور طرح طرح کی حرکات وسکنات پائی جاتی ہیں۔ اس کا مشاہدہ ہمیں ان مذاہب کے ماہانہ یا سالانہ تہواروں میں اچھی طرح ہو جاتا ہے جن کے ماننے والوں میں عملی وحدت اور یک جہتی کا فقدان ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں روحانیت اخلاقی و دینی رنگ پایا جاتا ہے، اس کے برعکس مسلمانوں کی مساجد، حج کے مقامات اور شعائر کی ادائیگی، سب میں یکسانیت، نظم و وحدت، ہم آہنگی اور باہمی ربط واتحاد پایا جاتا ہے۔ ان میں عقیدے اور عبادات کی وحدت ہوتی ہے کہ ایک ہی شریعت کے آگے سب سرنگوں ہوتے ہیں، اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ دینی تعلیمات میں حیرت انگیز وحدت اور اصالت ہے، دوسرے محدثین اور فقہاء کا کمال اور ان کا عظیم احسان ہے کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے اسلامی شریعت کے ذخیرہ کو نہ صرف محفوظ اور باقی رکھا بلکہ قرآن وسنت اور یکساں دینی نظام سے اس کو مربوط کر دیا۔

اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب اور شرعی احکام و مسائل کے استنباط میں جس اجتہادی بصیرت کا ثبوت دیا گیا وہ انتہائی بروقت مناسب اور برمحل تھا، اور فطری و منطقی تقاضوں اور اس انسانی، عالمی اور ابدی دین کی خصوصیات کے عین مطابق ـــــ جس طرح صرف ونحو، عربی زبان و بیان کے قواعد کی بنیاد قرآن مجید، عربی اشعار اور اولین عرب کے کلام پر رکھی گئی اور ان کا تدریجی ارتقاء ہوا، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ فقہ کی تدوین انتہائی ضروری تھی کہ عرب و عجم پر یہ دین حاوی تھا، اور اس کے دائرے میں داخل ہونے والا ہر مسلمان اس کا مکلّف ہے۔ اس لئے بھی کہ فقہ کا تعلق مسلمان کی پوری زندگی سے ہوتا ہے اور عقیدہ وعبادت سے اس کا غیر معمولی ربط و تعلق اور اخروی عذاب وثواب، نجات و ہلاکت اور سعادت وشقاوت کا دارومدار ان فقہی احکامات پر ہی ہے۔

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا طرزعمل:

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ائمہ اربعہ کے زمانہ میں جو لوگ تھے وہ ان ہی چاروں مسالک میں سے کسی ایک مسلک سے اس طرح وابستہ تھے کہ اس سے سرمو تجاوز کرنا وہ گناہ سمجھتے تھے اور اس وقت کا مسلم معاشرہ ان ہی چاروں فقہی مسلک کے درمیان منقسم ہو کر رہ گیا تھا اور ہر مسلک کے لوگ اپنے اپنے پرچم تلے کھڑے تھے، اس کی شہادت ہمیں فقہ اور علم کی تاریخ سے نہیں ملتی اور نہ ہی یہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی زندگی اور انسانی مزاج وخصوصیات سے کسی طرح ہم آہنگ ہے، بلکہ کسی خاص مذہب و مسلک کی تقلید کچھ عرصہ اور وقفہ کے بعد ہونے لگی۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کی تقویم کے لحاظ سے اس کی تحدید کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چوتھی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب کہ یہ چاروں مسلک اپنی پختگی اور کمال کو پہونچ چکے تھے اور خاص خطوں اور علاقوں میں پھیل چکے تھے، سیاسی، انتظامی اور تربیتی عوامل ومحرکات نے اس میں اہم کردار ادا کیا اور جن علاقوں اور خطوں میں مسلمان بستے تھے وہاں کی زندگی کا بھی تقاضا تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) نے (جن کو اللہ تعالیٰ نے فکری توازن، جامعیت، بلند نظری، کشادہ قلبی، انصاف واعتدال اور حدیث وفقہ میں غیر معمولی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی) اپنی ممتاز ومنفرد کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فقہی مسلک کے بارے میں جو مسلک اختیار کیا اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی دینی زندگی میں عبادات ومعاملات میں جو نئے نئے مسائل ومشکلات پیش آتے تھے ان کو وہ کس طرح حل کرتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ کیا راستہ اختیار کرتے تھے۔ حجۃ اللہ البالغۃ کے باب "حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها" (چوتھی صدی ہجری سے پیشتر اور اس کے بعد کے

لوگوں کا مسائل دینی کی تحقیق وعمل کے بارے میں کیا طرزِ عمل تھا؟) میں تحریر فرماتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہئے کہ چوتھی صدی سے قبل کے لوگ کسی ایک معین مذہب (فقہی) کی پابندی اور اسکی مکمل تقلید پر اجماع کئے ہوئے نہیں تھے، ابوطالب مکی (اپنی مشہور کتاب) ''قوت القلوب'' میں لکھتے ہیں کہ تصنیفی انداز کی کتابیں (اور فقہی مسائل کے مجموعے) اس زمانہ کے بعد کی باتیں ہیں، لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کا کہنا، کسی ایک مذہب پر فتویٰ دینا، اس کے قول کو دستور العمل بنالینا اور اسی کو نقل کرنا اور اسی مذہب کے اصولوں کی بنیادوں پر تفقہ کا پہلی اور دوسری صدی میں وجود نہیں تھا''۔

میں اس میں اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ دو ابتدائی صدیوں کے بعد تخریج کا کسی قدر سلسلہ شروع ہوا، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ چوتھی صدی کے لوگ ایک ہی مذہب کے دائرے میں رہ کر تقلید خاص کے پابند اور اسی کے مطابق مسائل واحکام میں تفقہ اور اسی مذہب کے تحقیقات واجتہادات کی نقل وروایت کے عادی نہیں تھے جیسا کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے۔

امت (اور مسلم معاشرہ) میں دو طبقے تھے: ایک علماء کا، ایک عوام کا۔ عوام کا تو قصہ یہ ہے کہ وہ ان اجماعی مسائل میں جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے وہ صرف صاحب شرع (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقلید کرتے تھے۔ وہ وضو، غسل کرنے اور نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ اور اسی طرح کی عبادات وفرائض، اپنے والدین یا اپنے شہر کے استادوں، عالموں سے اخذ کرتے تھے، اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، اور گر کوئی نئی بات پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے بھی جس حد تک ان کی رسائی ہوتی تھی کسی خاص مذہب کے تعین کے بغیر رجوع کر لیتے تھے اور اس سے مسئلہ پوچھ لیتے تھے۔

جہاں تک خواص کا تعلق ہے ان کا معاملہ یہ تھا کہ جن کا فن حدیث تھا وہ حدیث سے اشتغال رکھتے تھے، ان کو احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ کا اتنا ذخیرہ مل جاتا تھا کہ اس کی موجودگی میں ان کو اس مسئلہ میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ان کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی حدیث

جو درجہ شہرت، استفاضہ یا صحت کو پہونچی ہوتی تھی، موجود تھی، جس پر فقہاء اور علماء کبار میں کسی نہ کسی نے عمل کیا ہوتا تھا، اور اس کے پاس اس کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوتا تھا، یا جمہور صحابہ اور تابعین کے پے در پے ایک دوسرے کی تائید کرنے والے اقوال ان کے پاس ہوتے تھے، جن سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی، اگر ان میں سے کسی کو مسئلہ میں کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے اس کا قلب مطمئن ہوتا، نقول کے تعارض یا ترجیح کے اسباب کے غیر واضح ہونے کی وجہ سے یا کسی اور معقول سبب سے، تو پھر وہ اپنے پیشرو فقہاء اور علماء کے کلام کی طرف رجوع کرتا تھا، اگر اس کے بارے میں اس کو دو قول ملتے، تو ان میں سے وہ اس کو اختیار کر لیتا جو زیادہ قوی اور مدلل ہوتا، چاہے یہ قول علمائے مدینہ کا ہوتا یا علمائے کوفہ کا، جو تخریج (اجتہاد و استنباط) کی اہلیت رکھتے تھے، وہ ایسے مسئلہ میں جس میں ان کو کوئی صراحت نہیں ملتی تھی، تخریج و اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ لوگ اپنے اساتذہ یا اہل گروہ کی طرف منسوب کیے جاتے تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی ہے، علمائے حدیث میں بھی جو کسی مذہب سے زیادہ اتفاق کرتا تھا، اس کی طرف منسوب ہو جاتا تھا۔ مثلاً نسائی اور بیہقی کی نسبت امام شافعی کی طرف کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں قضاء و افتاء پر اسی کا تقرر کیا جاتا تھا جس میں اجتہاد کی صلاحیت ہوتی تھی، فقیہ بھی وہی کہلاتا جو مجتہد ہوتا، پھر ان صدیوں کے بعد دوسری طرح کے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے چپ و راست کا راستہ اختیار کیا۔

شاہ صاحبؒ غایت انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معین امام کا مقلد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبوی ہے، لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہے، اس تک براہ راست پہونچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے لئے

وقت وفرصت نہیں یا ایسے وسائل (علم وتحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلا لے یا ان سے مسئلہ استنباط کرے، شاہ صاحب علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرے، تحریر فرماتے ہیں:

''ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اس کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا اور حرام اس کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آنحضرت ﷺ (کے اقوال واحوال) کا علم حاصل نہیں، وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو وہ اس میں محض سنت نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث واصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کریگا، اور اس کو سنت وشریعت کا مخالف قرار دے گا''۔

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر برابر چلتا رہا ہے اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے، یا کبھی ایک سے فتویٰ لیتا ہے، کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے اور یہ کہ وہ معصوم ہے، تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بنا پر کہ ہم یہ جانتے ہیں وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے، اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں، یا وہ کتاب وسنت کے صریح حکم پر مبنی ہے یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب

اس بات پر مطمئن ہوگیا ہے، اس بنا پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جہاں علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے، اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آنحضور ﷺ کی طرف کی جاسکتی ہے لیکن ظنی طریقہ پر، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسول معصوم ﷺ جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کوئی حدیث قابل وثوق سند سے پہونچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے اور قول کے خلاف ہو اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا، اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟''

اس منصفانہ اور محققانہ تجزیہ کے بعد شاہ صاحب ان چار فقہی مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے بارے میں جن پر عالم اسلام میں عام طور پر عمل کیا جارہا ہے، اپنے رسالہ "**عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد**" میں جو "بقامت کہتر بہ قیمت بہتر" کا مصداق ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کردینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے، تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر، وعلی ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل واستنباط ہے، اور نقل جب ہی ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہوکر خرق اجماع نہ ہوجائے اس لئے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے، دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے، صرف ونحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار

کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے، لیکن واقعتاً ممکن نہیں۔

جب یہ بات متعین ہوگئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہوگیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جارہا ہے وہ سند صحیح سے مروی، مشہور کتابوں میں مدون ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے وہاں یہ پتہ چل سکے کہ اس میں قید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جاچکی ہو، اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جاچکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب واجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے جن میں یہ صفات پائی جاتی ہوں اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں، سوائے ان مذاہب اربعہ کے''۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اجتہاد وتقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے، جو مقاصد شریعت، فطرت انسانی اور واقعات کی دنیا سے پورے طور پر مطابق ہے، انھوں نے تقلید کے ساتھ یہ شرط لگادی ہے کہ اس بارے میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور کتاب وسنت کی پیروی ہے، اور یہ اس اعتماد پر ہے کہ ہم جس کو واسطہ بنارہے ہیں، وہ کتاب وسنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا محض نمائندہ اور ترجمان ہے، نیز یہ کہ ذہن اس کے لئے تیار ہے (خواہ اس کا موقعہ مدتوں میں آئے) کہ جب اس بات کا یقین پیدا ہوجائے گا کہ صورت حال اس سے مختلف ہے اور سنت سے ثابت حکم دوسرا ہے، تو ایک صاحب ایمان کو دوسری شکل کے اختیار کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔

فلا وربّك لا يؤمنون حتىٰ يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجاً مماقضيت ويسلموا تسليما (سورہ نساء/۶۵)۔

(تمھارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے)۔

اس دور میں اجتہاد کی باتیں بہت ہورہی ہیں اور یہ نعرہ لگایا جارہا ہے کہ اس زمانہ میں

اجتہاد کی ضرورت ہے، چنانچہ اجتہاد کا نعرہ لگانا ایک طرح سے ترقی پسندی کی علامت بن گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد اس زمانہ کی حاجت اور اس دین کی ضرورت ہے جو زندگی کے قافلے کی رہنمائی اور قیادت کرتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں اور بھی اس کی ضرورت ہے جب کہ تمدن اور صنعت وتجارت نے ایسی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کر لی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جدید تجارتی معاملات اور معاہدوں میں ایسے فقہی احکامات اور فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی فقہ کے اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں۔

لیکن شرعی مسائل اور جدید عصری ایجادات کے بارے میں جو لوگ اجتہاد کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں وہ اسلامی دنیا کے وہ قائدین ومفکرین اور مغربی دانش گاہوں کے فضلاء ہیں جنھوں نے خود مغربی تہذیب وتمدن کا سامنا پورے عزم وارادے اور ایمان ویقین سے کرنے میں اپنی مہارت اور ذہانت وذکاوت کا ثبوت نہیں دیا ہے حالانکہ ان کا فرض تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس کی سائنسی ایجادات اور ترقی، اس کی خوبیوں اور خامیوں کے درمیان تمیز کر کے وہی چیزیں لیتے جو مشرقی قوموں اور اس کے دین ومذہب اور تہذیب ومزاج سے میل کھائیں اور ان قوموں کو بھی روشنی دکھاتے جو مادیت کا شکار ہو چکی ہیں، وہ مغرب سے جو کچھ حاصل کرتے پہلے اس سے اس غبار کو جھاڑ دیتے جو قرون مظلمہ سے ہی ان کا جز بن گئی ہے اور اب بھی اس کی وجہ سے نفسیاتی کشمکش اور اعصابی تناؤ میں مبتلا ہیں۔ مغربی دانش گاہوں کے ان فضلاء کو اس کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ اس دور میں وہ ان علوم سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ جن میدانوں میں انھوں نے تخصص کیا ہے اور جو ان کا خاص موضوع رہا ہے اس میں بھی انھوں نے اپنے رول کو ادا نہیں کیا اور نہ ہی نظام تعلیم وتربیت کو آزاد اسلامی نظام تعلیم کے سانچے میں انھوں نے ڈھالنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ کام بھی اجتہاد ہی کی طرح ہے، لیکن انسان کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کر پاتا تو دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتا اور اس سے مطالبہ کر بیٹھتا ہے۔

اس گرفت اور احتساب کے باوجود یہ بات بہرحال اپنی جگہ صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد کی ضرورت اپنی جگہ پر ہے، اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں، جو لوگ علوم

شریعت میں بصیرت اور اس پر دسترس رکھتے ہیں وہ اس میدان میں اپنا قائدانہ کردار ادا کریں اور اصول فقہ جیسے قیمتی خزانہ سے جس کی کوئی نظیر قوموں اور ملتوں میں نہیں ملتی، احکام و مسائل کے استنباط میں فائدہ اٹھائیں، فقہ کا یہ ذخیرہ عرصہ سے صرف تاریخ بن کر رہ گیا ہے، جس سے ہمیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور کے مجتہدین کس طرح احکام و مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن وقت کی گھڑی کو نہ تو اپنی جگہ روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو معطل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو ماضی کی طرف واپس لوٹایا جا سکتا ہے، جبکہ اسلام ایسی قوموں اور معاشرہ کا دین ہے جو ان مسائل و مشکلات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ ان کا سامنا کرتا ہے۔

اجتہاد کے معطل ہونے کی وجہ:

مختلف ادوار، ملکوں اور شہروں میں امت نے اجتہاد کو اختیار کیا اور علماء اس پر گامزن رہے، مذاہب اربعہ کی کتابیں ان مثالوں سے بھری پڑی ہیں، لیکن تاتاری حملہ کے بعد مذاہب اربعہ (جدید مفہوم میں ہم اس کو علمی اکیڈمی یا ادارے سے تعبیر کر سکتے ہیں) پر کسی قدر پژمردگی اور کمزوری چھا گئی، اس لئے کہ تاتاری حملے نے خود اعتمادی اور ذہانت کے سوتوں کو خشک کر دیا تھا، جو قومیں تاتاری قوموں کے ماتحت ہوئیں ان کے اندر مسلح اور غیر مسلح لشکر کے مقابلہ کی جرأت ختم ہو کر رہ گئی، چنانچہ اسلامی دنیا کے مشرقی حصے کے علماء نے اس خاص وقفہ میں اجتہاد کی سرگرمیوں پر کسی حد تک پابندی لگانے ہی میں عافیت سمجھی، اس لئے کہ انھیں اندیشہ ہونے لگا کہ اگر اجتہاد کی اجازت دیدی گئی تو حکام اور والیان سلطنت کے سیاسی اور انفرادی مصالح کا اس میں خیال رکھا جائے گا اور اس سے نفع کے بجائے نقصان زیادہ ہوگا، اس کا بھی امکان ہے کہ دین میں تحریف کا سبب یہ انفرادی اجتہاد بن جائے یا اس امت کی رفتار میں انحراف اور کجی پیدا ہو جائے، اگر چہ ان علماء کا یہ خیال وقتی طور پر پابندی کے لئے تھا جس کی بنیاد فقہ کے اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ جلب منفعت پر دفع ضرر کو ترجیح دی جانی چاہئے۔

اب اگر اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہی ضروری ہے تو ضرور کھولا جائے لیکن اصول فقہ کی کتابوں میں اس کے لئے جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا لحاظ ضروری ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ انفرادی طور پر اجتہاد کے بجائے اجتماعی طور پر اجتہاد کیا جائے، وہ اس طرح کہ

شریعت کے ماہرین کی ایک اکیڈمی ہو جس میں کسی مسئلہ پر طویل غور وفکر، بحث ومباحثہ اور تبادلہ آراء اور قرآن وسنت اور فقہ واصول فقہ کے پورے ذخیرے کے بھرپور جائزے کے بعد فیصلہ کیا جائے، تاکہ اس میں کسی سازش یا کسی سیاسی قوت یا استبدادی حکومت کا عکس نہ پڑنے پائے۔

اجتہاد کے حدود اور اس کا میدان:

جدید طبقہ کے لوگ اجتہاد کی دعوت دیتے ہیں خصوصاً عصری دانشگاہوں کے پرجوش جذباتی نوجوان اور اسلامی ملکوں کے بعض سربراہ، ان کی اس دعوت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہر مسئلہ میں اجتہاد مطلق کی دعوت دے رہے ہیں، وہ مغربی اقدار و قیم اور عصری پیمانوں کو جوں کا توں لینے پر مصر ہیں۔ گویا کہ زمانہ پہلے اسلامی دور کی طرح ہو گیا ہے جب اسلام نیا نیا آیا تھا اور انسانی سوسائٹی مکمل طور پر انقلاب سے دوچار ہو گئی تھی اور گذشتہ دور میں فقہاء اور مجتہدین نے جو نتائج نکالے تھے اور علم و تحقیق اور مطالعہ کے بعد جو اصول انھوں نے بنائے تھے وہ اپنی قیمت اور اہمیت کھو چکے ہیں اور اب موجودہ زمانہ اور قوموں کے مزاج سے وہ ہم آہنگ نہیں، اس میں زیادہ تر سطحیت، لاپروائی، نام نہاد ترقی پسندانہ ادب کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کا اثر ہے۔ اس ادب نے نوجوانوں کے سامنے زمانہ کی ایسی تصویر کھینچی ہے جیسے یہ دور بالکل نیا ہے اور گذشتہ زمانہ سے یہ دور کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ تصویر تخیلات پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ برابر حقیقت نہیں، واقعیت اور منطقیت سے زیادہ اس میں جذباتیت سے کام لیا گیا ہے۔

اسلام ایک تغیر پذیر دنیامیں:

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کا اختتام اس تقریر کے اقتباس پر کروں جو میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک سمینار بہ عنوان ''اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں'' کی تھی۔

''زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں اپنی تغیر پرستی یا اقبال کے الفاظ میں'' تازہ پسندی'' کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بدکم ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری ہی کا نام ہے، زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن مرکب اور مجموعے کا نام ہے، جب کبھی اس کا تناسب بگڑے گا یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائے گا، تو زمانے، سوسائٹی

اور تہذیب کا قوام بگڑ جائے گا، ان دونوں کے تناسب کا معاملہ کیمیاوی اجزاء کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے۔ زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کو بدلنا چاہئے، اس کیلئے بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری، کمی یا عیب نہیں، وہ زندگی کا عین مزاج ہے اور زندگی کی تعریف ہے۔

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور بر ثمر نہیں کہلایا جا سکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھودے۔

تغیر پذیری یا اس کے بجائے اگر آپ اس کو نمو یا ترقی کا نام دیں تو میرے خیال میں آپ اس کے ساتھ زیادہ انصاف کر سکیں گے۔ زمانہ تغیر قبول کرنے کے ساتھ مقابلہ کی بھی ایک طاقت رکھتا ہے، ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی ہم کو صاف نظر آتے ہیں، لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء وعناصر کو محفوظ رکھنے کے لئے کتنی کشمکش کی اور کس قوت مقابلہ سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے، اس کے لئے ایک خاص طرح کی خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک دریا ہی کو آپ لیں جو روانی اور حرکت کے لئے سب سے بہتر مثال ہو سکتا ہے، دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مماثل نہیں ہوتی، لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود اپنے نام کے ساتھ، اپنے حدود کے ساتھ، اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم ہے، دجلہ وفرات آج بھی دجلہ وفرات کہلائیں گے اور گنگ وجمن آج بھی گنگ وجمن کہلاتے ہیں۔

زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے اور بہاؤ بھی، اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھودے گا۔

اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود، شخصیتیں اور ہستیاں ہیں سب کے اندر مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں، اور ان دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور وہ منصب پورا ہوتا ہے جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے:

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول نہیں کرسکتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن نہیں پسند کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے، یہ کسی تھرمامیٹر کی تعریف تو ہوسکتی ہے کہ وہ درجۂ حرارت وبرودت بتلائے، یہ مرغ بادنما (weathercock) کی بھی تعریف ہوسکتی ہے جو کسی ہوائی اڈے یا اونچی عمارت پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے، لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہوسکتی، میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کا مقام دینا چاہتا ہو، کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج (Acknowledge) کرتا رہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے، صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزیشن کو قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے اور اس کے لئے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے لیکن یہ محض ساتھ دینا، یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے، یہ غیر صالح تغیر ہے، یہ تخریبی رجحان ہے اور یہ تعمیری رجحان ہے، اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم سے کم اس مذہب کے پیرؤوں کے حق میں کیا ہوگا۔ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے وہاں وہ زندگی کا محتسب، نگراں، گارجین (Guardian) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے۔

گارجین کا کام یہ نہیں ہے کہ جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے، اس کے ہر صحیح وغلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرے۔ مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک ہی قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کردے، مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور ترغیب اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس

سے اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، اور اگر کوئی ایسی غلط دستاویز اس کے سامنے آتی ہے جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کرے گا بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو روکے، ماہر اخلاقیات ونفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کردے یا اپنا نقطہ نظر ظاہر کردے، لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے''۔

اگر ہم نے اس باریک بینی، گہرائی وگیرائی، امانت واحساس ذمہ داری، اس دین کے مزاج اور اس کے پیغام سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا اور اسی کے ساتھ ہم نے موجودہ زمانہ کے مزاج وخصوصیات کو سمجھا جس میں نمو اور تغیر کی صلاحیت ہے اور ثبات واستقامت بھی، اور اس نے قدیم صالح عناصر کو باقی بھی رکھا ہے، اگر ہم نے ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھ لیا تو فقہ اسلامی کی ضرورت (وسیع معنوں میں) کو ہم پوری کر سکتے ہیں اور ہم اسلامی سوسائٹی کی بھی ضرورتوں کو پوری کر سکتے ہیں اور اسلامی احکام اور دینی تعلیمات پر ہم اس مہذب اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی عمل کر کے دکھا سکتے ہیں، اور اس زندگی کا بھی ساتھ دے سکتے ہیں جو تیزی اور انتہائی سرعت کے ساتھ ترقی کرتی جا رہی ہے۔

وعلى الله قصد السبيل ومنها جائر

پہلے فقہی سمینار، منعقدہ یکم تا ۳/اپریل ۱۹۸۹ء جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں یہ خطبہ پڑھا گیا

اجتہاد اور فقہی بحث و تحقیق

محترم حضرات!

میرے لئے بڑی خوشی ومسرت کی بات ہے کہ اسلامی علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھنے والے علماء اور اصحاب تحقیق نے عصر حاضر کے فقہی واجتہادی مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کردی ہے۔ آج کا یہ اجلاس اس کی کھلی دلیل ہے۔

علوم وفنون کے خزانوں پر کسی خاص طبقے کا تسلط کبھی نہیں رہا ہے۔ اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ دین اسلام میں کوئی ایسا مذہبی طبقہ نہیں ہے جو نسلاً بعد نسل مذہبی امور کا وارث ہو، مذہبی جاگیرداری کے مفہوم نے نصرانیت کے کھوکھ سے جنم لیا ہے۔ لیکن دنیائے اسلام کے لئے یہ لفظ غریب اور غیر مانوس ہے۔ اگر بعض اہل علم کی عبارتوں میں اس طرح کی کوئی تعبیر پائی جاتی ہے تو اس کی بنیاد مغرب کی اندھی تقلید پر ہے۔ ہمارے اس دور میں مذہبی پروہت، رجال دین کی ایسی تعبیر بہت عام ہے حتی کہ عرب ادباء واہل قلم کے درمیان بھی، یہ لوگ اس لفظ کو ٹھیک اسی مفہوم میں استعمال کرنے لگے ہیں جس مفہوم پر لفظ "کھنہ" عالم نصیرانیت میں استعمال ہوتا ہے، لیکن ایسے محتاط اہل قلم جو دین پر مضبوطی سے قائم ہیں اور جو اسلامی فکر اور اسلامی روح کا صحیح تعارف کرنا چاہتے ہیں وہ حضرات سختی کے ساتھ ایسی عبارتوں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔

اسلامی علوم، اسلامی فقہ اور عصر حاضر کے اسلامی مسائل کی طرف علمی مدارس ومراکز کے خصوصی توجہ مبذول کرنے پر اپنے رشک ومسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری

سمجھتا ہوں کہ اسلام میں قسیسیت اور مذہبی جاگیرداری کی گنجائش بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔اس کے ساتھ ساتھ ایسے علماء کی ایسی جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے جنھیں اپنے فن میں پوری مہارت وبصیرت اور کامل درجہ کا اختصاص حاصل رہا ہے، لیکن اس دور میں جب کہ علم کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی ہوئی ہے اور علوم وفنون کا دائرہ غیر معمولی وسعت اختیار کر گیا ہے اور کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں رہی کہ وہ علم کے جملہ اقسام سے واقف اور ہر فن کا ماہر ہو۔ یورپ میں ترقی اس وقت شروع ہوئی جب کہ وہاں لوگوں نے علم کی مختلف فنون میں سے کسی خاص فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور وہاں کے علماء نے بیک وقت جملہ علوم وفنون پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے اس اصول پر اس وقت بھی مشرق سے زیادہ یورپ میں عمل ہو رہا ہے، وہاں ہر شعبے کا ماہر اپنے پیشے اور میدان اختصاص کے متعلق بلاتردد اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اسے دوسرے شعبوں اور دوسرے فنون کے ماہرین کے میدان اختصاص میں کوئی دخل نہیں ہے، اب ہمارے لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس بات کی پوری کوشش کریں کہ اپنی علمی وفکری کاوشوں کو کسی خاص موضوع اور علم وتحقیق کی بہت سی شاخوں میں سے کئی مخصوص شاخ تک محدود رکھیں۔

معیار ثقافت:

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں بھی اس علمی قافلے کا ہم سفر ہوں اور اس وقت کو غنیمت خیال کرتے ہوئے بعض تجاویز پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، آپ ہماری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے حلقے میں ثقافت کا معیار پست ہوتا جا رہا ہے، میں نے یہ چیز مغرب میں بھی محسوس کی اور مجھ سے وہاں کے بعض علماء نے کہا کہ مشرقی علوم کے مطالعہ وتحقیق میں بھی فساد راہ پایا گیا ہے، ضرورت ہے کہ علماء کی نئی نسل صبر واستقلال، اور پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ بحث وتحقیق میں لگے، اس انحطاط کے متعدد اسباب ہیں جن میں کچھ سیاسی ہیں اور کچھ اقتصادی ومعاشی۔

استشراق کی ترقی کا راز:

وہاں علم کی مختلف شاخوں میں سے ہر شاخ کے پیچھے شروع سے اب تک کچھ ایسے اشیاء وعوامل کارفرما رہے ہیں، انہیں عوامل نے استشراق کو اس بام عروج تک پہونچا دیا۔ اس میں بعض طبیعاتی علوم کا استثناء کیا جاسکتا ہے۔

مستشرقین کی تحقیقات کو اہم مقام حاصل تھا اور مستشرقین اپنی کتابوں کے ذریعہ بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت حاصل کر رہے تھے، کیونکہ اس کے پیچھے جو سب سے بڑا عامل کارفرما تھا امپریلزم تھا (اس کا مقصد ہے کمپنیوں اور اقتصادی اداروں، اور سیاسی نفوذ کے ذریعہ اپنے تاثرات پھیلانا)، اور ہمیں خوشی ہے کہ وہ عامل اب موثر نہیں رہا، چنانچہ مشرق کا سب سے مالدار ملک مسلمانوں کے زیر حکومت تھا، اور مغرب ان مسلمانوں کو ان برکات وثمرات کی وجہ سے جوان کے پاس تھا غیرت اور حسد کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

مغربی امپریلزم نے نوآبادیات قائم کرنی چاہی، اس لئے اس کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ ان ممالک کی قومی خصوصیات کا جائزہ لے، اور وہاں کی عوام کے علمی و دینی مصادر میں شکوک وشبہات اور بداعتمادی پیدا کرے، اور ان ممالک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اسکالروں کے دل میں احساس کمتری پیدا کرے تاکہ یہ چیزیں ان ممالک میں بیرونی اثر ورسوخ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوں، کیونکہ تہذیبی وثقافتی اثرات، اور عقلی اور علمی سرافگندگی، سیاسی تفوق اور برتری سے زیادہ موثر ہوا کرتی ہیں، اور کم از کم یہ کہ سیاسی نفوذ کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں اور اس کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔

یہ مستشرقین سامراجیوں کے ہراول دستہ تھے، چنانچہ انھیں سرکاری حلقوں کا بھرپور تعاون ملا، اور ڈھیر سا مال ان کے تصرف میں دیدیا گیا، بادشاہوں کے دربار اور حکمرانوں کی قلمرو میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا اور بھرپور اعزاز واکرام ہوتا تھا۔

اس عامل کا وجود اب ختم ہو گیا، رہا دوسرا عامل یعنی اقتصادی، تو اس نے بھی اپنی تاثیر کھودی، اور اقتصادی اساس تو وہ انقلاب کا شکار ہو گئی یہاں تک کہ مشرقی علوم کے مطالعہ و تحقیق کا جاری رکھنا پہلے کی طرح مادی نفع کا باعث نہیں رہا۔

علمی و تحقیقی یکسوئی:

اس دور کے علماء اور تعلیم یافتہ افراد میں محنت اور جانفشانی کی روح کمزور پڑ گئی جس کی وجہ سے علم کا شوق بھی کم ہو گیا اور اس کے ساتھ جد و جہد کی قدرت کا چشمہ خشک ہو گیا۔ میرا اشارہ کسی خاص مدرسے یا علمی مرکز کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام بات ہے جسے تقریباً ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حصول علم و کمال کے لئے وہ مکمل یکسوئی اور جان توڑ کوشش جو ماضی کے علماء کا طرۂ امتیاز تھا دور حاضر میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا، اسکے اسباب کا تعلق کسی خاص چیز سے نہیں ہے بلکہ سیاست اقتصاد و معیشت اور ادب و اخلاق سب سے اس کا مساویانہ تعلق ہے۔ اس کے اسباب سے بحث کرنا ناممکن ہے اور نہ یہاں اس کی ضرورت ہے۔۔ بہت واضح سی بات یہ ہے کہ علم کا شوق جو ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے، اور انسان کو اس درجہ بے قرار کر دیتا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لباس و پوشاک کی بھی پرواہ نہیں کرتا، وہ شوق اگر ختم نہیں ہوا ہے تو نادر و نایاب ضرور ہو گیا ہے۔

علم برائے علم:

ماضی میں ایک تنہا عالم متعدد اکیڈمیوں کا کام انجام دیتا تھا، اب صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ بڑی بڑی اکیڈمیاں اور علمی و تحقیقی ادارے قائم ہیں لیکن اس کے باوجود نتائج اور کارکردگی تشفی بخش نہیں ہے، اور کوئی اہم اور نئی تحقیق کم ہی سامنے آتی ہے۔

اس وقت ہمیں اس کی شدید ضرورت ہے کہ ثقافتی معیار بلند ہو، رسوخ فی العلم اور فقہی بصیرت میں ترقی ہو، علم میں ایک طرف محنت ہے پھر اس کا ثمرہ ہے، پہلے پیاس ہے پھر آسودگی

ہے بھوک ہے، پھر شکم سیری ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ علم و جستجو کی راہ میں پوری دیانتداری کے ساتھ محنت کرے اور اس کو وہ اپنے عمل کا بدلہ اور مکافات تصور کرے، اور اس محنت اور تخصص کو کسی یونیورسٹی میں اونچی پوسٹ کا ذریعہ نہ بنائے۔

اس دور کا ایک المیہ یہ ہے کہ اہل علم اپنی محنت کا ثمرہ نقد وصول کرنا چاہتے ہیں، اور ان کی زیادہ توجہ شہرت و ناموری، عہدہ کی ترقی اور زیادہ معاوضہ حاصل کرنے پر مرکوز رہتی ہے اور انکی طاقت وصلاحیت کا حصہ ان مقاصد کے حصول کی راہ میں صرف ہوتا ہے، گویا مادی منفعت ہی ان کی نگاہ میں اصل معیار ہے، آپ نے بہت سے اصول کے بارے میں سنا ہوگا، اور نیا اصول جو ہمارے ثقافتی اداروں میں عام ہے وہ ہے کیریرزم (Careerism)۔

علم کی پیاس وقتی نہیں ہونی چاهئے:

دوسری چیز یہ ہے کہ ثقافتی سرگرمیوں کی طرف نظر اور توجہ سرسری نہیں ہونی چاہئے کہ ہم غور وفکر کے لئے ایک موضوع کا انتخاب کریں پھر فوراً ہی جگالی کر کے اسے باہر ڈال دیں جیسا کہ جانور جگالی کیا کرتا ہے، پس ایسا نہ ہو کہ ہمیں نہ موضوع کا زیادہ اہتمام والتزام ہو، اور نہ اس سے کوئی گہرا ربط و تعلق ہو کہ جب اس موضوع پر بحث ختم ہو جائے تو ہم ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو جائیں، اس موقع پر اقبال کا یہ شعر ہمارے پیش نظر رہے:

مقصود ہنر سوز حیات اُبدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

اسلامی تحقیق کے سرچشمے ایمان میں پوشیدہ هیں:

اسلامی علوم اور عصر حاضر کے دینی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت کا تذکرہ آپ علمی و دینی مقالات میں ضرور پڑھتے ہونگے اور ہم میں سے ہر شخص کو اس ضرورت کا احساس اور اس فکر سے اتفاق ہوگا، لیکن سوچنا یہ ہے کہ باب اجتہاد بند کیوں ہو گیا؟ اس کے اسباب کیا ہیں، اور

اس دعوی میں کس درجہ صحت ہے؟ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے اور عنقریب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کروں گا کہ علوم اسلامیہ کے اصول دین میں پوشیدہ ہیں اور دین ہی ان اصولوں کا سب سے بڑا سر چشمہ ہے، لہذا ضروری ہے کہ ہمارا موقف مستشرقین سے جدا گانہ ہو، اور یہ کہ ہمارا موقف کسی اکیڈمی جیسا نہ ہو کہ ہم کسی التزام اور احساس ذمہ داری کے بغیر مسائل پر بحث کریں بلکہ ان کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہونا چاہئے کہ یہ چیزیں ارکان ایمان کے ساتھ مربوط اور ہماری علمی زندگی میں جاری وساری ہوں، میں نے بچپنے میں مقولہ سنا تھا:

برائے یک من علم دہ من عقل باید

اگر ایسا نہ ہو تو انسان علم کا حقیقی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا، اور نہ مناسب صورت میں اس کا استعمال کر سکے گا۔ میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہوئے کہوں گا کہ بحث وتحقیق کے ساتھ مناسب مقدار میں تقوی کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی علوم کا ہے جس کا دین سے گہرا ربط ہے، لہذا ان دینی اصول کو بحث وتحقیق کے سامنے اس طرح پیش نہیں کر سکتے جس طرح کسی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے پیش کیا جاتا ہے، جی ہاں! انصاف کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ایسا ہو، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بحث میں نقد واعتراض، استہزاء اور تمسخر اور تحقیر و تذلیل سے خالی ہو۔ جن حضرات کو بحث وتحقیق کی ذمہ داریوں کا شعور اور افکار ونظریات کی تبدیلی کا احساس ہے انہیں چاہئے کہ وہ اپنی آراء واحکام کو قطعی اور یقینی شکل میں پیش نہ کریں، اور اپنے کسی نظریے کی توجیہ اس انداز میں نہ کریں کہ گویا وہ اس موضوع پر حرف آخر ہو، اور مزید غور وفکر کی اس میں مطلق کوئی گنجائش موجود نہ ہو بلکہ ان کا موقف اور پیش کرنے کا انداز ایسا ہو جیسے کوئی کسی نتیجے تک پہونچا اور اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہو کہ وہ صحیح ہے۔۔۔۔ ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم غور وفکر اور بحث ومباحثے میں صبر وتحمل کا اصول اختیار کریں اور علم اور ان حاملین کا اعتراف کرنا سیکھیں جنہوں نے اپنی زندگی اور اپنی تمام تر طاقتیں اور صلاحیتیں اس راہ میں صرف کر دی ہیں۔

انتشار پیدا کرنے سے اجتناب:

کچھ لوگ اپنی رائے کے اظہار میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں، پھر فوراً ہی اس سے رجوع بھی کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں لیکن پھر ان لوگوں کا کیا ہوگا جو ان کے فتووں کی اتباع کر کے اور غلطی پر عمل کر کے اس دنیا سے چل بسے؟ اور مسئلہ اس وقت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب ان آراء کا تعلق دین اور عقیدے سے ہو۔ لہذا ضروری ہے کہ رائے کے اظہار میں صبر کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے، خاص طور پر جبکہ مسئلہ کا تعلق عالم دین سے ہو، تو ہمیں چاہئے کہ تھوڑی دیر سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور وفکر کریں، اور اس فن کے ماہرین کے سامنے اسے پیش کریں، ان کے فیصلوں کا انتظار کریں، ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی فتوی کی اشاعت ہو اور اسے منظر عام پر لایا جائے، یہ دور انتشار ہے اور انسان سست و کاہل واقع ہوا ہے، فطری طور پر لاپرواہی کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی تہذیب، علمی ترقی کی تیز رفتاری اور معیار زندگی میں مسلسل ترقی، یہ وہ چیزیں ہیں جس نے انسان کو آرام وآسائش کا دلدادہ اور اختلاف وانتشار کا جلد شکار ہو جانے والا بنا دیا ہے، جب یہ صورت حال ہے تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسی چیزوں کے اظہار سے باز رہیں جو لوگوں میں فکری اضطراب پیدا کر سکتی ہوں یا اس میں اضافے کا سبب بن سکتی ہوں۔

زمانہ میں تغیر اور ثبات:

عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ زمانہ میں ثبات اور دوام نہیں ہے بلکہ تغیر اور انقلاب ہی کا دوسرا نام ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، زمانہ دو عناصر سے مرکب ہے، تغیر اور استمرار، اگر زمانے میں ان دونوں کا توازن برقرار نہ رہے اس طور پر کہ استمرار و دوام تغیر اور تبدیلی پر غالب آجائے یا تغیر اور انقلاب ثبات اور دوام پر حاوی ومستولی ہو جائے تو معاشرہ اور تہذیب وتمدن پر اس کے بہت برے اثرات مرتب ہوں گے، انسانی معاشرے کے لئے ان دو عناصر کا توازن و

اعتدال کسی بھی کیمیائی مرکب سے زیادہ ضروری ہے۔ زمانہ میں انقلاب کی قدرت وصلاحیت اور اس میں انقلاب کا رونما ہونا ضروری ہے اور یہ کسی ضعف یا نقص کی علامت نہیں ہے، بلکہ وہ تو قانون زندگی ہے، اور بقول علامہ اقبال:

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن اسی کے ساتھ زمانے میں انقلابات وتغیرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی بھرپور ہے، تغیر وانقلاب کے آثار ومظاہر واضح طور پر ہمارے سامنے ہیں، اور ہم میں سے ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ کتنے وسیع پیمانے پر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

عام اور مادی امور میں ہمیں اس کشمکش کا پوری طرح احساس نہیں ہوسکتا جو زمانہ اپنی عمدہ خصوصیات اور اپنی طبیعت اور حقیقی صفت کی حفاظت کے لئے کر رہا ہے، اس کے لئے ایک خاص خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک ندی کو لے لیجئے جو حرکت کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔۔۔اس کی دو موجیں بالکل ایک جیسی نہیں ہوتیں، اور اپنی گذر جانے والی موجوں کے باوجود وہ اپنے نام اور تمام خصوصیات کے ساتھ ہزاروں سال سے اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ دجلہ وفرات، دریائے نیل، گنگا اور جمنا، کل پچھلی صدیوں کی طرح آج بھی انہی خصوصیات کی حامل ہیں۔

اسی طرح زمانہ متحرک ہونے کے ساتھ ساکن بھی ہے، زمانہ کی یہ دونوں جوہری صفتیں ہیں، اسی طرح زمانہ اپنی دونوں بنیادی صفتوں میں سے کسی ایک کے بغیر اپنی افادیت باقی نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مثبت اور منفی قوتیں عالم میں موجود تمام زندہ ومروجہ چیزوں میں قوت ونمو پیدا کرتی ہیں، اور اپنے عمل اور ردّ عمل کے نتیجہ میں یہ چیزیں اپنی قدر وقیمت کو باقی رکھتی ہیں۔

دین زندگی کا محافظ ہے:

میں اپنے اس عقیدے کے ساتھ کہ یہ دین دائمی وابدی ہے، کبھی اس بات کو قبول نہیں

کرسکتا کہ یہ دین کسی حال میں بھی ہر تغیر کو قبول کرسکتا ہے اور آپ لوگ بھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ دین کوئی تھرمامیٹر نہیں ہے جس کا کام صرف درجہ حرارت کو ناپنا ہوتا ہے، اور نہ وہ مرغ بادپیا ہے جس کے ذمہ صرف ہوا کے رخ کو متعین کرنے کا کام ہو۔

ایسی عبارتوں کے ذریعہ دین کی تعریف نہیں کی جاسکتی، اور ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو دین کا یہ مطلب سمجھے کہ اس کا کام ایک رجسٹر کی طرح ہے جو حوادث زمانہ کو بتلاتا ہے، کوئی نام نہاد وضعی دین اس صورت حال کو برداشت نہیں کرسکتا، تو پھر اللہ کا نازل کردہ وہ سچا دین جو قیامت تک کے لئے ہے وہ کس طرح اس صورت حال کا تحمل کرسکتا ہے۔ دین تغیر و تبدیلی کو ایک حقیقت واقعہ کی طرح تسلیم کرتا ہے اور صحیح سالم انقلاب کی بنا پر امور و معاملات کے فروغ کے لئے ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے، دین زندگی کے ساتھ شانہ بشانہ چلتا ہے، وہ اس کی جلو میں ایک خادم یا تابع کی حیثیت سے صرف چلنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ بتلائے کہ فلاں انقلاب انسانیت کے لئے یا اس کے پیروکاروں کے لئے مفید ہے یا مضر، دین اگر زندگی کے ساتھ ایک طرف چلتا ہے تو دوسری طرف وہ اس کا محافظ، گارڈ اور اتالیق بھی ہے، اس پر اسکی پاسبانی ونگرانی کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، ایک مربّی اور سرپرست کا یہ کام نہیں کہ اس کی سرپرستی میں جو بچہ ہے اس کے ہر عمل کو جائز قرار دے، اور اسکے تمام اچھے برے میلانات ورجحانات کی تائید وتصویب کرے، اور وہ جس چیز کے پیچھے بھی دوڑ رہا ہے اس پر تائیدی مہر لگائے، اس کے پاس تو صرف ایک مہر ہے اور ایک سیاہی اور ہاتھ ہے، اس کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اپنی مہر کسی بھی دستاویز یا چیک پر لگادے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ صحیح غلط کے درمیان امتیاز کرے، پہلے وہ دستاویز کی تفتیش کرے، پھر اپنا حکم صادر کرے، اگر اس میں کوئی غلطی وضرر پائے تو دین اس کی کوشش کرے کہ نرمی کے ساتھ اسے چھوڑ دے اگر ایسا ممکن ہو، یا اگر ضرورت ہو تو اس سلسلے میں قوت کا استعمال کرے، اور اگر اس کے سامنے کوئی

نسخہ پیش کیا جائے اور وہ اسے نسل انسانی کے لئے مضر سمجھتا ہے تو محض اس کی تصدیق و تائید اور مہر لگانے ہی سے باز نہیں رہتا بلکہ اس کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، یہیں سے دین واخلاق کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ دین اپنی ڈیوٹی اور ذمہ داری سمجھتا ہے کہ غلط خیالات اور غلط کام کو روکے اور اس کی راہ میں رکاوٹ بنکر کھڑا ہو جائے، جبکہ اخلاق اس کے جائز و ناجائز اور اس کے ممدوح یا مذموم ہونے کی طرف محض اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہے۔ ہمارے بابصیرت فقہاء اور راسخین علماء کرام کی ذہانت و عبقریت، زمانے کی ترقیات، عرف ومقیاس کے بدل جانے، نئے آلات و وسائل کے وجود میں آ جانے، حوادث و مشکلات کے پیدا ہونے، نئے تجربات کے سامنے آنے اور نئی تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں پوری طرح ظاہر ہوئی، اسی طرح فتاوی اور شرعی احکام میں حالات زمانہ کی رعایت کرنے، روح شریعت اور مقاصد شریعت کی حفاظت کرنے میں دین اسلام کی ابدیت اور اس کے وہ آخری اور پسندیدہ دین ہونے کا اعتقاد رکھنے اور اللہ رب العزت کے فرمان ”**الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**“ (المائدہ) پر کامل یقین رکھنے پر بھی ان کی ذہانت وصلاحیت کا پورا ظہور رہا۔

اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں اس عالمی فقہی کتب خانے کا وسیع تاریخی جائزہ لینا ہوگا جو اسلام کی طویل تاریخ اور عالم اسلام کی وسیع مساحت پر پھیلی ہوئی ہے، اگر یہ کام پوری امانت و دیانت، صبر وتحمل اور غیر جانبداری اور انصاف کے ساتھ انجام دیا جائے تو علمی و دینی ذہانت و عبقریت اور قانون سازی کی بے مثال صلاحیت کا اندازہ ہوگا جو سب کے لئے باعث حیرت و تعجب ہیں، اور یہ چیز اس اجتہاد اور فقہی بحث و تحقیق کے حق میں بھی مفید ہوگی جس کی ضرورت اس دور اور وسیع اسلامی معاشرے کو ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس برصغیر کے اندر ماضی قریب میں افتاء اور فقہی

تحقیقات کا جو کام ہوا ہے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے، اور جہاں تک علمی وفقہی تصنیفات، فتاوی کے مجموعوں اور حدیث وفقہ کی بحثوں کا تعلق ہے تو اس مختصر سے مقالہ میں انکا نام شمار کرنا بھی مشکل ہے، اس کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہمارے والد ماجد حضرت علامہ عبدالحی حسنی کی تصنیف ''الثقافہ الاسلامیہ فی الہند'' کی طرف رجوع کیا جائے، جسے مجمع اللغہ العربیہ دمشق نے شائع کیا ہے۔ یہاں پر میں فقہ الحدیث پر علامہ ظفر احمد عثمانی کی تالیف اعلاء السنن کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا جو انہوں نے مربی جلیل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حکم پر تالیف کی ہے، یہ عظیم تصنیفی کام اکیس ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔

اسی طرح معاشرتی وازدواجی زندگی سے متعلق بعض پیچیدہ مسائل کا شرعی وفقہی حل تلاش کرنے میں بھی کچھ مفید اور قابل قدر علمی کاوشیں ہوئی ہیں، مثال کے طور پر مربی کبیر عالم جلیل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ''الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة'' اور ''بوادر النوادر'' کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب دیوبندی مفتیٔ اعظم پاکستان کی ''جواہر الفقہ'' تین جلدوں میں، اور ان کی ''احکام القرآن'' اور شیخ عظیم مصلح مولانا عبدالشکور لکھنوی کی ''علم الفقہ''، اور اس کے علاوہ فتاوی کے بہت سے مجموعے ہیں، مثلاً مفتی عزیز الرحمٰن سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کی ''عزیز الفتاوی'' بارہ جلدوں میں، اور حضرت تھانوی کی ''امداد الفتاوی'' چھ ضخیم جلدوں میں، اور مفتی عبدالرحیم لاجپوری کی ''فتاوی رحیمیہ'' چھ جلدوں میں۔

اس بابرکت تاریخی موقع پر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام کا خوشی و مسرّت اور احترام وعقیدت کے ساتھ تذکرہ کروں گا، یہ ایک نہایت مبارک اور برمحل اقدام تھا جو اپنے وقت پر اٹھایا گیا، اور یہ مفید تعمیری علمی وفقہی نظریے کے حق میں ایک بڑی فتح شمار کی جائے گی، جس نے جدید فقہی کتب خانہ تیار کرنے اور اس ترقی

یافتہ اور روز افزوں ترقی پذیر دور میں علمی کارکردگی کے میدان میں نئے گوشے کھولے اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اور یہ اقدام ان لوگوں کے خلاف بھی ایک دلیل ہے جو فقہی موضوعات پر اختصاص کرنے والوں پر سستی اور کاہلی اور باہم علمی تعاون نہ کرنے اور ایک ساتھ مل کر نہ بیٹھنے کا الزام لگاتے ہیں۔

الحمد اللہ اس اکیڈمی کے متعدد کامیاب اور نتیجہ خیز اجتماعات ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ اس مبارک سلسلے کو قائم و دائم رکھے۔

تیسرے فقہی سمینار، منعقدہ ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء، دار العلوم سبیل الرشاد بنگلور میں پیش کردہ خطبہ

گرامی منزلت جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب! نفع اللہ بہ الامۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

آپ نے مجھے ساتویں فقہی سمینار میں مقالہ پڑھنے کی دعوت دے کر میری عزت افزائی بھی کی اور بعض حقائق کی طرف توجہ دلانے کا موقع بھی دیا جو عام طور پر نظر انداز ہورہے ہیں، میں نے ارادہ اور کوشش کی کہ آپ کے دیئے ہوئے موضوع ''عہد حاضر کے چیلنج اوران کے حل کا طریقہ'' پر کوئی نیا مقالہ تیار کروں لیکن صحت پٹنہ سے آنے کے بعد سے بہت متاثر ہے اور یہاں کے کئی پروگرام اور مشغولیتیں بھی سامنے آئیں، آخر میں ذہن میں یہ آیا کہ میں اپنے ایک عربی مضمون کا ترجمہ پیش کردوں، جس میں بعض شدید خطروں اور اندیشناک صورتحال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور وہ ہمارے صاحب فکر اور صاحب درد علماء کی توجہ کی بھی مستحق ہے، اس کا عنوان تجویز کیا گیا تھا ''ایک المناک حقیقت اور اسکے ازالہ کے لئے امکانی جدوجہد'' آپ اگر چاہیں تو اسکا عنوان اپنا ہی تجویز کیا ہوا ''عہد حاضر کا چیلنج اور اس کے حل کا طریقہ'' کردیں۔

راقم کی خواہش ہے کہ یہ المناک حقیقت اور آئندہ نسلوں کے لئے ذہنی اور تہذیبی ارتداد کا خطرہ ہمارے علماء اور اہل فکر کے سامنے آجائے۔

شرکائے مجلس اور علماء باوقار کی خدمت میں سلام و درخواست دعاء۔

والسلام

دعاگو و طالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

۲۳ر دسمبر ۱۹۹۴ء

ایک المناک حقیقت اور اس کے ازالہ کے لئے امکانی جدوجہد

محترم علماء!

جن حضرات کی ممالک اسلامیہ اور دول عربیہ (ممالک عربیہ) کے موجودہ حالات پر وسیع اور گہری نظر ہے، ان کو براہ راست وہاں کا سفر کرنے اور کبھی کبھی معتد بہ قیام کرنے کی نوبت آئی ہے، یا وہاں کے اخبارات ورسائل اور وہاں سے شائع ہونے والے لٹریچر پر ان کی مسلسل اور گہری نظر ہے اور اس کے ساتھ ان ملکوں کے "انتظامیہ" اور حکمراں جماعتوں یا قانون ساز اداروں کے رجحانات، اقدامات، اعلانات اور تشکیل نو کے منصوبوں اور عزائم سے واقف ہونے کا ان کو موقع ملتا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان ملکوں کے اصحاب اقتدار (اور کسی حد تک قائدین واہل فکر) میں کچھ عرصہ سے "اسلامی اقتدار کے لئے جدوجہد ہی سے نہیں اسلام کے غلبہ اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی دعوت وترغیب سے" ایک خوف وہراس، نزاکت احساس، جس کو ہم ادباً "توہم" و "اختلاج" سے تعبیر نہ کریں تو ضرورت سے زیادہ "احساس خطر" اور شدت اندیشہ سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کو انگریزی میں (ALLERGY) اور عربی میں "حساسیہ زائدہ" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ طرز فکر اور نفسیاتی کیفیت بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اسلام کے حدود وتعزیرات کے نافذ کرنے کے مطالبہ، معاشرہ کو اسلامی قالب میں ڈھالنے، نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ اور قانون سازی کو شریعت کے تابع بنانے کی تحریک و دعوت اور سعی و جدوجہد سے خائف ہونے پر منحصر نہیں رہ گئی ہے، کہیں عام دینداری، فرائض کی شدت واہتمام سے پابندی، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے بیزاری، بعض اہم اسلامی شعائر کے اعلان واحترام کے مظاہرہ ومطالبہ سے بھی خائف ہونے کی حد شروع ہوگئی ہے، اور اس حقیقت کے شاہد بعض عرب ملکوں (خصوصاً لیبیا، تونس، الجزائر اور کسی حد تک مصر) کے وہ اعلانات واقدامات ہیں جن کا ذکر کرنے سے ندامت وشرمندگی کے علاوہ اس بات کا بھی اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر اسلامی ملکوں اور خصوصاً برصغیر ہند میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی

دینے میں فرق نہ پڑ جائے اور ان کے بعض فرائض شرعی اور قوانین اسلامی مثلاً مسلمانوں کے اپنے عائلی قانون (Personal Law) پر عمل کرنے کی مخالفت اور اس کے بالمقابل ان کو غیر اسلامی قانون کے تابع بنانے مثلاً یونیفارم سول کوڈ (Uniform Civil Code) کے نافذ کرنے کا جواز نہ پیدا ہو جائے، جس کو مسلمانوں نے اپنی عمومی جدوجہد اور ہندگیر تحریک کے ذریعہ ناکام بنا دیا تھا، اور پارلیمنٹ نے سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف مسلمانوں کے عائلی قانون کی بقا اور تحفظ کے فیصلہ کا تھا۔

اس غیر طبعی و غیر شرعی صورت حال کے پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے یہاں چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ اولاً مغربی نظام تعلیم جس کے نتیجہ میں بالخصوص اوپر کے مراحل میں تعلیم پانے والے نوجوانوں میں، (جن کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آنے والا ہے اور وہی عام طور پر کرسی حکومت پر متمکن ہیں) اپنے دین، شریعت، تہذیب اور تاریخ کے بارے میں احساس کمتری (Inferiority Complex) کا پیدا ہونا، جو تعلیمی نصاب، مغربی لٹریچر اور مستشرقین کی کتابوں کا (جو تحقیق و مطالعہ کا نقطہ عروج سمجھی جاتی ہیں) لازمی نتیجہ ہے، اس مغربی نظام تعلیم کے مشرق اسلامی میں بے محل، مضر بلکہ قاتل ہونے کی مثال اس سے بہتر نہیں دی جا سکتی جو ایک مغربی فاضل نے اپنی کتاب میں لکھی ہے:

> ''ایک مشرقی حکایت غیر محتاط غیر ملکی تعلیمی مشیروں سے سرزد ہونے والی غلطیوں کی پوری تصویر کشی کرتی ہے، کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، جس میں ایک بندر اور ایک مچھلی پھنس گئے، بندر تیز طرار اور تجربہ کار تھا، لہٰذا ایک درخت پر چڑھ کر وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ مقام پر جا بیٹھا، اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے، پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا، پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے'' (۱)

یہ مثال ان مشرقی اور اسلامی ملکوں پر پورے طور پر صادق آتی ہے، جنھوں نے مغربی

---

1. (I.N. Thut and don Adams: Education patterns in contemporary societies (Mograw hill book co. New York, P.63)

نظام تعلیم کے نفاذ اور مغربی اقدار و معیار (Values and Ideals) کو مقبولیت اور تسلیم شدہ حقائق بننے کا موقع دیا(۱)

۲۔ اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کی ہر عہد میں رہنمائی و قیادت کرنے کی صلاحیت، اور اس کی افادیت و ضرورت بلکہ تفوق و امتیاز ثابت کرنے بلکہ دل نشین بنانے کی اکثر ممالک اور بیشتر مدت حیات میں منصوبہ بند مفکرانہ اور یقین افروز سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، مختصر الفاظ میں اونچے پڑھے لکھے طبقہ میں اسلام کی صلاحیت بقا اور ہر عہد میں اس کی ضرورت پر نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد بحال کرنے کی منظم، مؤثر اور عمر و ذہانت اور صلاحیت فہم کے مطابق کوئی عام مؤثر تحریک یا دعوت نہیں چلائی گئی، کچھ انفرادی و سطحی کوششیں ہوئیں اور کچھ محدود اور قلیل التعداد لٹریچر وجود میں آیا (جس کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا) لیکن اس کو دعوت کا ایک عام میدان اور مؤثر کوششوں کا موضوع اور ہدف نہیں بنایا گیا(۲) جسکا نتیجہ حکمراں طبقہ، اہل علم کی ایک بڑی تعداد، جامعات (Universities) کے پروفیسروں، دانشگاہوں کے ذمہ داروں، اور ذرائع ابلاغ پر اثر و تسلط رکھنے والوں کے ذہن، اسلام کی نشأۃ ثانیہ، اس کی صلاحیت قیادت بلکہ صلاحیتِ بقا کے بارے میں بھی اگر مایوس نہیں تو متردد و متشکک نظر آتے ہیں، اور جب یہ طبقہ منصب قیادت یا منصب حکومت پر متمکن ہو جاتا ہے تو وہ سیکولرزم (Secularism) ''علمانیت'' ہی کو مشکلات کا واحد حل اور اقتدار و حکومت کی بقا کا ضامن سمجھتا ہے اور اس وقت یہی رجحان بہت سے مسلم ممالک اور چند عرب ممالک میں کام کر رہا ہے۔

۳۔ ایک اعتراف حق، اظہار حقیقت اور ایک مؤرخ و ناقد کے بے لاگ جائزہ کے تقاضہ سے اس حقیقت کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے اور حکمراں و قانون ساز اور دانشور طبقہ کے دینی و دعوتی تحریکات اور اسلامی بیداری کی دعوت دینے والوں

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' کا باب ''عالم اسلام میں تجدد و مغربیت کی تحریک'' (ص ۵۴۔۸۷) اور کتاب کا باب ''مغربیت کے عالمگیر رجحان کے اسباب اور ان کا علاج'' ص ۲۴۲۔۲۵۵

۲۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش ص ۲۴۲۔۲۵۲ اور مصنف کا عربی رسالہ ''الحاجۃ إلی الترکیز علی جانب حاسم فی مجال الدعوۃ'' شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ)

سے خائف و محتاط رہنے میں اس کو بھی دخل ہے کہ یہ تجربہ میں آیا ہے کہ ان میں سے بہت سی تحریکیں، اصلاح عقائد واعمال، رجوع الی اللہ، تمسک بالشریعہ اور عمل بالدین کے لئے شروع ہوئیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ سیاست کے میدان میں آگئیں اور انھوں نے (نیک مقاصد کے ساتھ سہی) حکومت واقتدار پر قبضہ کرنے اور ملک کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش شروع کر دی اور ان کا براہ راست حکومتوں سے تصادم ہو گیا۔

یہ اسی غلط اندیشی کا نتیجہ ہے جس کو راقم السطور نے اپنے عربی سفرنامہ یمن (۱) میں ایک یمنی عالم کے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''راستے دو ہیں: ایک یہ کہ ایمان کرسی والوں (صاحبان اقتدار و اہل حکومت) تک پہنچ جائے اور وہ ملک و معاشرہ میں دین کی نمائندگی کریں، اسلامی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور شریعت کے احکام کا نفاذ کریں اور دینداروں اور اہل علم کا طبقہ ان کی حمایت و نصرت کرے اور ان کے لئے دعا گو رہے، لیکن وہ کسی بڑے منصب اور اس سے بڑھ کر حکومت کے حصول کی کوشش نہ کرے، دوسرا طرز فکر اور طرز کار یہ ہے کہ اہل ایمان (دینی دعوت دینے والے اور اسلامی تحریکوں کے قائدین) خود کرسیوں تک پہنچ جائیں اور حکومت واقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آ جائے، پہلا طرز فکر اور طرز عمل مثبت نتائج پیدا کرنے والا اور اہل دین و اہل حکومت کو براہ راست ٹکراؤ سے بچانے والا ہے، دوسرا طرز فکر اور طرز عمل (براہ راست کرسی حکومت پر متمکن ہو جانے کی کوشش اور ہدف) مشکلات پیدا کرنے والا، اہل دین ہی نہیں بلکہ دین سے ٹکر لینے اور اس سے خائف اور متوحش ہونے پر آمادہ کرنے والا ہے''۔

انھوں نے فرمایا:

''میں نے آپ کی کتابوں سے یہی سمجھا ہے کہ آپ پہلے طرز فکر اور طرز عمل کو (ایمان کے کرسی حکومت تک پہنچ جانے کی کوشش اور صاحب اقتدار طبقہ کو دین کی حمایت و نصرت پر آمادہ کرنے کی سعی) بہت سی غیر ضروری مشکلات اور حکومت کی دین سے معرکہ آرائی سے بچنے والا سمجھتے ہیں، دوسرا طرز فکر و طرز کار صدہا مشکلات پیدا کرنے والا اور ایک ایسی جنگ آزمائی و محاذ

۱۔ (یہ کتاب ''نفحات الایمان بین صنعاء وعمان'' کے نام سے ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے شائع ہو چکی ہے)

آرائی کی فضا پیدا کرنے والا ہے جس میں توانائی اور وقت کا ضیاع ہے اور دینی مستقبل کو مشکوک بنانے والا ہے"

راقم نے عرض کیا کہ اس عاجز کا بالکل یہی خیال ہے، اور ہندوستان کے مصلح اعظم مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (متوفی ۱۰۳۴ھ) کا یہی طرزِ عمل تھا، جس نے ہندوستان کی مسلم سلطنت کے مغلیہ خاندان میں انقلاب پیدا کر دیا اور سلطان جلال الدین اکبر (متوفی ۱۰۱۴ھ) سے لے کر (جو ہندوستان کو کھلے طور پر برہمنیت اور ہندو تہذیب اور مخالف اسلام عقائد کی طرف لے جا رہا تھا) سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ (متوفی ۱۱۱۸ھ) (تک جن کو بعض اہل نظر نے "چھٹا خلیفہ راشد" کے لقب سے یاد کیا ہے) مسلسل انقلاب آتا رہا اور ہر تخت نشین کے بعد اس کا جانشین اس سے بہتر ہوتا رہا، یہاں تک کہ ہندوستان اس عمومی خطرہ ارتداد سے بچ گیا جس کا ڈر اکبر کے اقدامات واحکام اور عزم اور منصوبہ سے پیدا ہو گیا تھا(۱)

ایک اظہار حقیقت اور احتساب نفس کے تقاضے سے اس کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ بہت سی دینی دعوتوں اور تحریکوں نے اس معاملہ میں عجلت سے کام لیا، اور ان کے قائدین کے بعض اقدامات واعلانات اور اس سے زیادہ ان کے تابعین اور ترجمانوں نے غیر ضروری طریقہ پر بعض اسلامی حکومتوں کو اپنا حریف بنا لیا، بعض اسلامی وعرب ملکوں میں اسی چیز نے ان کو اسلامی بیداری اور اسلام ودین کے نام پر جماعت سازی سے خائف بنا دیا، جن کا اثر ورسوخ ان ملکوں میں بڑھتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ جماعت کو خلاف قانون قرار دینے اور اس کے ارکان کو قید وبند کا مرحلہ پیش آ گیا، شہادت بالحق کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس میں ان جماعتوں اور ان کے قائدین کا قصور کم، اہل حکومت کے توہمات کا جس کو کسی شاعر نے اس بلیغ مصرعہ میں ادا کیا ہے۔

عشق است وہزار بدگمانی

کا حصہ زیادہ تھا، لیکن بہر حال اس تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، اور اس کی روشنی میں غیر ضروری مشکلات کے پیدا ہونے، بلکہ حکومتوں کو اسلام کا حریف اور دین وشریعت کے ادنی نفاذ کا مخالف اور دعوت واصلاح کے کام کو آزادانہ طریقہ پر انجام دینے کے مواقع کو ختم کرنے

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ چہارم

والا نہیں بنانا چاہئے۔

۴۔ اسلامی بیداری، دین وشریعت کی ترویج واشاعت اور حکومتوں کے اسلام سے کھلے ہوئے انتساب بلکہ افتخار سے خائف ہونے اور علمانیت (Secularism) کا میلان پیدا کرنے میں امریکہ کی بالواسطہ اور بلاواسطہ کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے، اس نے روس کے انقلاب اور کمیونزم (Communism) کے زوال کے بعد اسلام ہی کو اپنا حریف اور اپنے عالمی اقتدار کے راستہ میں سب سے بڑا خطرہ اور سدراہ سمجھ لیا ہے، اور اس نے دوسرے ذرائع ابلاغ اور سیاسی تدبیروں سے کام لینے کے بعد اب اصول پسندی، عقیدوں کے استحکام اور دینی ودنیوی معاملات میں دین و شریعت کو حکم سمجھنے اور بنانے کے خیال و عقیدہ (جس کو وہ "Fundamentlism" کے نام سے یاد کرتا ہے) کے خلاف عالمگیر پیمانہ پر پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے، اور بعض ایسی زبانوں سے بھی اس کی ناپسندیدگی اور اس پر تنقید کا کام لیا ہے، جس کی بالکل توقع نہیں تھی

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانہ میں

اب ہم ان ''روشن خیال'' اور ''ترقی پسند'' اسلامی ملکوں کے ذمہ داروں اور اصحاب اقتدار سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس اصول پسندی، عقیدہ واصول کی پابندی پر تنقید کرنے اور اس سے بے اطمینانی کا اظہار کرنے اور ایسی دعوت وکوشش کے نتائج (جن میں یا تو کھلے طور پر ''علمانیت'' "Secularism" کا اظہار ہو یا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے) خود ان کے لئے اور ان کے ملک ومعاشرہ کے لئے بڑے بڑے خطر اور مضر ہوں گے، وہ بہت بڑی طاقت اور دولت سے محروم ہو جائیں گے اور بے ضرورت مشکلات ومصائب کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا۔

ا۔ پہلی اور اساسی بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت وحمایت سے محروم ہو جائیں گے جو دین کی نصرت وحمایت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ مشروط ہے۔ ''إن تنصروا الله ينصركم ويثبت أقدامكم'' (سورہ محمد:۷) (اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا)۔

''ولينصرن الله من ينصره'' (سورہ حج:۴۰) (اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس

کی ضرور مدد کرتا ہے)۔

"کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله" (سورہ بقرہ:۲۴۹)

(بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے)۔

ان کا ملک اور ان کا دائرہ حکومت اس سب سے بڑی طاقت اور دولت سے محروم ہو جائے گا جس نے باوجود قلت تعداد، بے بضاعتی اور بے سروسامانی کے دنیا کا نقشہ بدل دیا، بازنطینی سلطنت کا چراغ ایک طرف اور ساسانی شہنشاہی کا چراغ دوسری طرف گل کر دیا، کتنے ملک، جن کی سیکڑوں برس کی تہذیب، جنگی تجربہ اور جنگی ساز وسامان تھا ان پر فتح حاصل کی، ان کو حلقہ بگوش اسلام بنایا، وہاں کی زبان وتہذیب کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھال دیا، اور صدیوں تک ان پر حکمرانی کی اور اب بھی کثیر التعداد ملکوں پر حکمرانی کر رہے ہیں، وہ دولت ایمان، شوق شہادت، جذبہ جہاد اور حمیت دینی تھی جس کا سرچشمہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات پر یقین، آخرت پر ایمان، اور جنت کا شوق تھا اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

"ولاتهنوا فى ابتغاء القوم إن تكونوا تألمون فإنهم يألمون كما تألمون وترجون من الله ما لايرجون وكان الله عليما حكيماً (سورہ النساء:۱۰۴).

(اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو اسی طرح وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں، اور تم خدا سے ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے، اور خدا سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے)۔

اور یہ وہ خلا ہوگا جس کو کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی اور وہ خسارہ ہوگا جس کی تلافی کسی قوت دفاع، جدید اسلحہ اور بڑے ملکوں کی سرپرستی بھی نہیں کر سکتی "وذلك هو الخسران المبين".

۲۔ اس غیر دینی رجحان، دین اور اہل دین سے عدم مناسبت بلکہ وحشت اور اپنے ملک وقوم کے سامنے (سیدنا عمر بن العزیز، سلطان صلاح الدین ایوبی اورنگ زیب نہ سہی) ایک صاحب حمیت مسلمان اور پابند شرع حکمراں اور دین واہل دین کے قدرداں کی حیثیت سے نہ آنے سے ان کو اعتماد ومحبوبیت کا اور جذباتی طور پر حمیت وحمایت کا وہ فائدہ اور طاقت حاصل نہ

ہوگی جو ایسے حکمرانوں کو حاصل ہوتی ہے اور جس سے وہ بڑی بڑی مشکلات پر قابو پاتے ہیں اور ان کے لئے بے دریغ جانیں دی جاتی ہیں، وصدق اللہ العظیم:

"إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن وداً" (سورہ مریم:۹٦) (اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کردے گا)۔

اس کے برعکس ملک میں سازشیں ہوں گی، ان کو ناکام بنانے اور ان کا بدل مہیا کرنے کے خفیہ منصوبے بنائے جائیں گے اور ان کی بڑی توانائی اور وقت ان سازشوں کا پتہ چلانے، مخالفین کا سراغ لگانے اور ان کو محبوس یا شہر بدر کرنے میں صرف ہوگا، اور ایسے موقع پر کوئی بڑا ملک یہاں تک کہ امریکہ بھی ان کی مدد نہیں کرسکے گا۔

اب ہمارے بیدار مغز اور حقیقت شناس حکام سلطنت، صاحب اقتدار طبقہ اور ملک و معاشرہ کا سانچہ ڈھالنے والوں کو غور کرنا چاہئے کہ ان دونوں مقابل راستوں میں سے صدق واخلاص، ایمان وحمیت اسلامی، شریعت کے نفاذ، نئی نسل کو اسلامی الفکر واسلامی العمل بنانے کا کام؟ یا اس کے مقابلہ میں نامذہبیت وعلانیت، غیر محدود وغیر مشروط روشن خیالی وترقی پسندی، مغرب کی تقلید ونقالی اور کسی بڑی سے بڑی طاقت اور ملک کی غاشیہ برداری زیادہ مفید و بہتر ہوگی؟

یہ وہ حقائق ہیں جن کو ان ملکوں کے قائدین، اصحاب اقتدار اور علم وفکر کے علم برداروں، ذرائع ابلاغ کے ذمہ داروں اور علم وادب، فکر وتحقیق کے اجارہ داروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے، اور یہ وقت کا اہم ترین فریضہ ممالک اسلامیہ وعربیہ کی اہم ترین خدمت اور تبلیغ ودعوت کا مؤثر ترین اور اہم ترین شعبہ ہے، اس کو نظر انداز کرنے اور اس کی اہمیت نہ سمجھنے سے خطرہ ہے کہ یہ ممالک نامذہبیت اور کھلے ہوئے (اعتقادی نہیں تو ذہنی، فکری اور تہذیبی) ارتداد تک نہ پہنچ

جائیں، جس کی ان ممالک کے اسلاف کے مبلغانہ اور مجاہدانہ، مؤمنانہ اور زاہدانہ کارناموں سے جو تاریخ میں محفوظ ہیں اور جن کی برکت سے ملک کے ملک مسلمان اور متبع شریعت ہیں، امید نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ ان کو ان حقائق کی سمجھ عطا فرمائے گا، اسلام کی قدر بخشے گا، اور پھر صراط مستقیم کی طرف اور اپنے اسلاف کی سیرت ونمونہ کی طرف آنا ہوگا، اور وہ اس عہد میں وہ کردار ادا کریں گے جو ان کے اسلاف نے ادا کیا، جس کی اس وقت دنیا کو سخت ضرورت ہے اور وہی اس عہد کا سب سے بڑا خلا ہے۔

" وما كان الله ليضيع إيمانكم إن الله بالناس لرؤوف رحيم" (سورہ بقرہ: ۱۴۳)

اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یوں ہی کھودے، خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحب رحمت ہے۔ لیکن بہر حال یہ اہل دعوت وحمیت دینی اور علمائے راسخین کا فرض ہے کہ یہ حقائق اور یہ تأثرات ان قائدین ممالک اسلامیہ وعربیہ، اہل اقتدار، اہل قلم اور اہل فکر تک پہنچائیں۔

وما علينا إلا البلاغ

ساتویں فقہی سمینار، منعقدہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء تا ۲ر جنوری ۱۹۹۵ء

دار العلوم ماٹلی والا بھروچ میں پیش کردہ خطبہ